ڈاکٹر خورشید رضوی کی غزل_ کلاسیکیت وجدیدیت کا سنجوگ

ڈاکٹر فرزانہ ریاض
ویزٹینگ فیکلٹی، شعبہ اردو، جی سی، یونیورسٹی لاہور۔

Abstract

Dr. Khurshid rizvi is a versatile, thoughtful and world recognized poet, but many aspects of the exotic splendour of his art and thought have yet to be arranged and studied. one such aspect is an impact of classical poets on his poetry. Dr. khurshid rizvi accepted the impact of the classical poets in his ghazals with the true touch of genius and took it one stage forward. However his love for the classicism is also evincible in his poetry.

اردو میں غزل کی کوئی تین چار صدیوں کو پر محیط روایت موجود ہے۔ ان دو ڈھائی سو سالوں میں ہماری زندگی کا قافلہ جن راہوں سے بھی گزرا ہے، ہماری تہذیب جن منزلوں سے بھی روشناس ہوئی ہے۔ اس کی سچی اور صحیح تصویر ہماری غزل میں ملتی ہے۔ اس عرصے میں ہم نے جو کچھ بھی محسوس کیا ہے، جو کچھ بھی سوچا ہے، جو تصوّرات بھی قائم کیے ہیں، جن نظریات کی بھی تشکیل ہوئی ہے، ان سب کی صحیح آئینہ داری جیسی غزل سے ہوئی ہے شاید ہی کسی اور صنفِ ادب نے کی ہو۔ خود غزل کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے!

بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو ایک طرف غزل میں کلاسیکی انداز میں لکھنے والے شعرا ابھی تک قدیم رنگِ غزل کی پیروی کر رہے تھے جن میں شاگردانِ میرؔ و داغؔ کی کثرت تھی۔ پھر لکھنوی شاعروں کا ایک گروہ تھا جو انیسویں صدی کی پر تکلف غزل سے دامن کشاں ہو کر تقلید میرؔ و غالبؔ کا انداز اپنا رہے تھے۔ پھر ایسے غزل نگار بھی تھے جو کلاسیکی غزل کے لہجے کو اپناتے ہوئے نئے تجربات کر رہے تھے اور ان کا کلام پزیرائی حاصل کر رہا تھا خصوصاً ناقدین ان کی طرف خصوصی توجّہ مبذول کر رہے تھے۔

۱۹۴۷ء کے بعد شعرائے غزل کا قافلہ انجمن ترقی پسند مصنفین، حلقۂ اربابِ ذوق، حلقۂ ادب اسلامی، پاکستانی ادب اور لسانی تشکیلات کی تحریکوں اور کئی انفرادی رجحانات میں منقسم ہو گیا تھا۔ ہمیں ان شعرا کے ہاں کلاسیکی، نو کلاسیکی، جدید اور جدیدیت پسند شاعری کے الگ الگ رنگ نظر آتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان میں روایتی غزل کا یہی وہ مثبت رجحان ہے جو ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے ساتھ ساتھ خاموش دھارے کی طرح چلتا رہا، جس نے نامساعد حالات اور وقت کے اندھے اور گہرے سمندر میں خود کو ضم نہیں کیا بلکہ اپنے لیے اسی سمندر میں راستہ پیدا کرتے ہوئے خراماں روی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔

پاکستانی شعرا میں سے ایسے کئی شاعر تھے جو کلاسیکی رجحان سے متاثر رہے اور اپنی غزل میں کلاسیکیت کے ساتھ جدیدیت کی آمیزش کی۔ ڈاکٹر خورشید رضوی اردو ادب کے ان معدودے چند شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے نہ صرف اردو غزل کے کلاسیکل مزاج کو اپنایا بلکہ اس میں جدیدیت کو آمیز کر کے اس میں حیرت انگیز بوقلمونی پیدا کی:

دنیا رہی خوابیدہ، خورشید نے شب بھر میں
چھم سے شفق لا کر پورب میں بچھا ڈالی

یہ انتہائی دشوار گزار عمل ہے۔ جہاں شاعر کو دیارِ غزل میں پہلے ہی فنی لحاظ سے اور محدودیت کی بنا پر سنبھل سنبھل کر چلنا ہوتا ہے وہاں اس دوہرے عمل یعنی کلاسیکیت اور جدیدیت کو بھی برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ یہ فعل قادر الکلام شعرا ہی سرانجام دے سکتے ہیں جو وسعت مطالعہ، گہرے مشاہدے اور زبان و عروض کے علاوہ شاعری کے بارے میں واضح نقطۂ نظر رکھتے ہوں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے خورشید رضوی کے مجموعۂ کلام ''شاخِ تنہا'' میں اس بات کی بجا طور پر نشان دہی کی:

> ''خورشید رضوی کے مجموعے میں رومانیت اور کلاسیکیت کا سنجوگ دکھائی دیتا ہے۔ وہ لفظ کو تراشنے اور سنوارنے کا گُر جانتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کے اشعار نگینوں کی طرح لَو دیتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر صناعی عمل کے ساتھ ساتھ اس نے زاویۂ نگاہ کی تازگی کو بھی ہر جگہ برقرار رکھا ہے اور پٹی ہوئی پامال شعری فضا سے باہر آنے میں کامیابی حاصل کی۔'' (۱)

جب شاعر اس بات پر قادر ہو کہ نئی شراب کو پرانے شیشوں میں اس طور سے پیش کرے کہ تندیٔ صہبا سے پرانے آبگینے پگھلنے لگیں اور ہیئت تبدیل ہونے لگے تو حاصل ہونے والی شرابِ ناب میں پرانے دنوں کی ایک چاشنی بھی ہوتی ہے اور نئی شاموں کا دھیما پن بھی۔ جب شاعر حقائق اور علوم کو شعر میں یوں پیش کرے کہ وہ شعر، شعر ہی رہے، تو سونے پہ سہاگہ ہے۔ سائنس اور نفسیات سے گہرا شغف رکھنے والے شاعر شہزاد احمد نے ڈاکٹر خورشید رضوی کے بارے میں یہی بات لکھی تھی کہ خورشید رضوی کی ذات میں جدید علوم کے تنوعات اور قدیم علوم کے لوازمات یوں اکٹھے ہو گئے ہیں کہ نقطۂ اتصال پر بالکل نئے پن کا احساس ہوتا ہے، جو تخلیق کا خاصہ ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''خورشید رضوی کے زیرِ نظر شعری مجموعے شاخِ تنہا کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے بار بار یہ احساس ہوا کہ اس کے رومانی اور کلاسیکی دونوں رویوں نے قدم قدم پر ایک دوسرے سے مصافحہ کیا ہے جس کے نتیجے میں اس کے

ہاں ایسا شعری مواد وجود میں آیا ہے جو کلاسیکی رکھ رکھاؤ سے عبارت بھی ہے اور رومانی پلک کا حامل بھی۔'' (۲)

ڈاکٹر خورشید رضوی کے اب تک پانچ شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ شاخ تنہا (۱۹۷۴ء)، سرابوں کے صدف (۱۹۸۱ء)، رائگاں (۱۹۹۶ء)، امکان (۲۰۰۴ء) اور دیریاب (۲۰۱۳ء)۔

''دیریاب'' کی اشاعت سے قبل ان کے چار شعری مجموعے الگ الگ شائع ہونے کے بعد ''یکجا'' کے عنوان سے کلیات کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ نے اپنے ایک مضمون ''روایت اور انفرادی شخصیت'' میں روایت پر بڑی دلکش بحث کی ہے۔ ایلیٹ کا خیال ہے کہ روایت وراثتی طور پر نہیں ملتی بلکہ اسے سخت محنت سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے تاریخی شعور کی ضرورت ہے:

"you have the whole past at your back."(3)

یہی تاریخی شعور ڈاکٹر خورشید رضوی کے شاعرانہ سفر میں کارفرما نظر آتا ہے:

زہر اب ہوں میں یا قند ہوں میں
یا دونوں کا پیوند ہوں میں

ڈاکٹر خورشید رضوی، اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کے امین ہیں۔ ان کی شاعری میں ہمیں (طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض، کے مصداق) میرؔ، مصحفیؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور یگانہؔ سے لے کر مجید امجدؔ، ن۔م راشدؔ، میراجیؔ اور یہاں تک کہ شکیبؔ جلالی اور ناصر کاظمیؔ جیسے بڑے شاعروں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی نے ان سب کی آوازوں کو ایک نئے کورش کی شکل دے دی ہے۔ لیکن اس نیم تقلیدی روش کو بھی انھوں نے تخلیقی سطح پر قبول کیا، اور اس کی اثر پذیری کو بڑھا دیا:

پڑو نہ عشق میں خورشیدؔ ہم نہ کہتے تھے
تمھیں بتاؤ کہ جی کا زیاں ہوا کہ نہیں

(شاخِ تنہا)

اب اس شعر کو میرؔ کے درج ذیل شعر کے تناظر میں دیکھیں:

لگا نہ دل کو کہیں، کیا سنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میرؔ کا اس عاشقی نے حال کیا

(میرؔ)

میرؔ کے اپنے دور میں یہ تہذیب صرف میرؔ ہی کو میسر آ سکی اور میرؔ تنہا اپنے غبار کو راہ گزارِ لیلیٰ سے بچاتا رہا:

دور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

اس کیفیت کا اعکاس ڈاکٹر خورشید رضوی کا یہ شعر دیکھیے:

لبوں پہ آج سرِ بزم آ گئی تھی بات
مگر وہ تیری نگاہوں کی التجا کہ ''نہیں''

(شاخِ تنہا)

یہ شعر اگر چہ میرؔ کے ''دور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے'' کے ہم پلہ نہیں، مگر پھر بھی جو تہذیبی رکھ رکھاؤ، ثقافتی رچاؤ اور جس باطنی سجاؤ کا اظہار اس شعر میں ہوا ہے، بہر حال وہ کم یاب ضرور ہے۔

میرؔ کا رنگ اختیار کرنے والوں میں غالباً ڈاکٹر خورشید رضوی سب سے زیادہ کامیاب رہے۔ ان کی کامیابی کا راز یہ نہیں ہے کہ ان کی غزلوں میں وہی دل شکستگی، دل گیری، خودداری، گوشہ گیری، فقیر منشی، حزن و حسرت، صبر و ضبط اور حلاوت آمیز تلخی پائی جاتی ہے جس سے میر کی غزلوں کی فضا عبارت ہے بلکہ یہ کہ انھوں نے بعض بڑے گہرے ذاتی تجربات و مشاہدات کو میرؔ کے لہجے میں بیان کی ہے۔ میرؔ کا کہنا تھا:

تصویر کی مانند لگی دور ہی سے گزری

(میرؔ)

اس کیفیت کی عکاس ڈاکٹر خورشید رضوی کی ایک پوری غزل ہے جس کا مطلع ہے:

یہی ہے عشق کہ سرد و مگر دہائی نہ دو
وفورِ جذب سے ٹوٹو مگر سنائی نہ دو

(شاخِ تنہا)

روایت سے استفادہ اگر روایت کو آگے بڑھانے کے لیے ہو تو اس کو روایت کے مثبت اثرات سے ہی تعبیر کرنا چاہیے۔ ان کے ہاں رواں دواں اور تراشیدہ مصرعے، مترنم الفاظ، شیریں اور سبک تراکیب دکھائی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان لکھتے ہیں:

> ''خورشید رضوی رسمی شاعر نہیں بلکہ ان کا شمار ان جدید شعرا میں ہوتا ہے جو غزل کی پوری روایت کو اپنے اندر جگہ دے کر اور اپنے زمانے کے رجحانات کو ساتھ ملا کر ایک نیا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے خورشید رضوی جدید شاعری میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔''(۴)

غزل کی روایت کی کئی صدیوں کا استحکام ان کی غزل میں پوری تاباتی کے ساتھ موجود ہے۔ انھوں نے کہیں تہات و استعارات، کہیں تلمیحات و اشارات اور کہیں علائم و رموز کے ذریعے اپنے عہد کے رنگا رنگ موضوعات کو خوش اسلوبی سے غزل کے روایتی سانچے میں ڈھالا ہے۔

چمن، گل و بلبل، دانہ و دام، قفس، صبا، بہار و خزاں، صحرا، جنگل، دریا، تنہائی، دشت، قطرہ، موج، مے و مینا، شمع و پروانہ، رقیب، نامہ بر، فراق، وصال، زخم، تیر، شجر اور اس نوع کے دوسرے تلازمات نے خورشید رضوی کی

روایت پسندی کو مستحکم کرنے میں مدد دی ہے:

میں نقشِ پا ہوں وسعتِ صحرا میں پائمال
کیا حال پوچھتی ہے صدائے جرس مرا
(دریاب)

بہہ گئی عمرِ رواں آبِ رواں کی صورت
اور مرے عکس سے تکتا رہا دریا مجھ کو
کس سے چھپ چھپ کے ملنے کو جاتی ہے تو
جنگلوں میں بتا اے صبا کون ہے؟
(دریاب)

آنکھ میچو گے تو کانوں سے گزر آئے گا حسن
سیل کو دیوار و در سے واسطہ کوئی نہیں
(شاخِ تنہا)

اے شمع ایک تو ہی نہیں کشتۂ سحر
دل بھی بجھا بجھا ہے طلوعِ سحر کے ساتھ
(شاخِ تنہا)

نشہ فراق کا برسوں میں جا کے راس آیا
کشاں کشاں مرا ذوقِ شراب بدلا ہے
(سرابوں کے صدف)

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''اس نے کلاسیکی غزل کے سلسلوں سے منحرف ہونے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان سے وابستہ تلازمات کو بڑی خوبی سے اپنی شاعری میں برتا ہے۔ شاعری میں سب سے مشکل کام یہی ہے کہ نئی شراب کو پرانے آبگینوں میں پیش تو کیا جائے، مگر اس طور کہ آبگینہ تندیِ صبا سے پگھل کر کچھ سے کچھ ہو جائے۔ بلکہ یوں محسوس ہو جیسے آج سے پہلے اس آبگینے کو استعمال میں لایا ہی نہیں گیا تھا۔''(۵)

عشق و محبت کے معاملات کلاسیکی اردو غزل کا پسندیدہ موضوع ہے جس کے تلازمات جا بجا مختلف النوع صورتوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ عشق اور دل کی یہ وارداتیں شاخِ تنہا ہے۔ ان کے چوتھے مجموعے امکان تک پھیلی

ہوئی ہیں۔

غمِ دنیا، غمِ دیں، عشق و ہوس، جذب و خرد
ہر سمندر میں ہیں دو چار سفینے دل کے

(سرابوں کے صدف)

تم سمجھتے ہو بچھڑ جانے سے مٹ جاتا ہے عشق
تم کو اس دریا کی گہرائی کا اندازہ نہیں

(شاخِ تنہا)

ان سے مل کر بھی کہاں مٹتا ہے دل کا اضطراب
عشق کی دیوار کے دونوں طرف سایہ نہیں

ڈاکٹر خورشید رضوی نے روایت کو منہدم کیے بغیر زبان، لہجے، تجربے اور احساس کی ایک نئی فضا جس طرح اپنی غزلوں میں سموئی اس نے غزل کو ایک نیا پس منظر فراہم کیا ہے۔ احساس کی دھیمی آنچ، لہجہ کی نرمی، کیفیت میں حیرت و استعجاب، ماضی کا پر اشتیاق تذکرہ، یادوں میں بسی ہوئی تہذیب کی خوشبو ڈاکٹر خورشید رضوی کی غزل کی خصوصیات ہیں۔ ان کو غزل کی روایت کا گہرا شعور ہے اور وہ اس روایت میں بدلتی ہوئی زندگی کے نئے طرزِ احساس کو شامل کر کے اردو غزل کی روایت کا حصّہ بنانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اپنی شاعری میں ڈاکٹر خورشید رضوی نے روایت اور جدید عصری تقاضوں کے باہم رچاؤ سے بھرپور کام لیا ہے اور انتہائی کامیابی سے اپنے ماضی الضمیر کو دوسروں تک پہنچایا ہے اور یوں فن کی ایک ایسی روش اختیار کی ہے جو زندگی کے قدرتی ارتقائی عمل کا خاصا ہے جس کی وجہ سے اس کے اظہار میں الجھاؤ اور گنجلک پنج کی بجائے سادگی اور صفائی پیدا ہوگئی ہے اور اس طرح ان غزلوں میں رچے ہوئے فکری اور جذباتی معاملات تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ انھیں اپنی لفظیات پر دسترس ہے اور وہ غزل کی روایت کے سبھی حوالوں کو پیشِ نظر رکھ کر زبان و بیان کا حق ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پرانے اسلوب سے نیا اسلوب پیدا کرنے کی کوشش بھی ملتی ہے۔ رواں دواں اور تراشیدہ مصرعے، مترنم الفاظ، شیریں اور سبک تراکیب ان کے ہاں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں۔ خاص طور پر غزل کے نئے اسلوب کی تشکیل میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''خورشید رضوی کا اسلوب انتہائی تازہ، خوب صورت اور پُرکشش ہے۔ اس کے ہاں کلاسیکی غنائیت بھی ہے اور زمانۂ حال کی وہ تیز نگاہی بھی جو عالمِ کبیر اور عالمِ صغیر دونوں کی کُنہ تک پہنچنے کی سعی میں ہے اور اس سب پر مستزاد ایک ایسی ''پُراسراریت'' جس کا کوئی نام نہیں ہے۔''(۶)

ترے ہجر ، تیرے خیال ، تیرے وصال میں
ترے آئینے میں ، میں سب کا سب نہیں آ سکا

(امکان)

یہ جو نگ تھے یہ جو نام تھے مجھے کھا گئے
یہ خیالِ پختہ جو خام تھے مجھے کھا گئے

(رائگاں)

ہوئے رنگ اور لفظ گرد سفر
رہا بس تو اک دیدۂ نم رہا

(امکان)

وہ جو مجھ میں ایک اکائی تھی وہ نہ جُڑ سکی
یہی ریزہ ریزہ جو کام تھے مجھے کھا گئے

(رائگاں)

ڈاکٹر خورشید رضوی نے اپنی غزلوں کو خالص روایتی سانچے میں ڈھالا ہے اور اپنے پیش روؤں کی عظمتِ فن، شعورِ حیات اور اسلوبِ بیان پر اضافے کیے ہیں۔ ڈاکٹر خورشید رضوی نے جو کلاسیکی آہنگ اور اسلوب اپنے کلام کے ذریعے لائے وہ آج بھی تتبع کے قابل ٹھہرا ہے۔ ڈاکٹر خالد اقبال یاسر لکھتے ہیں:

''خورشید کے غم انمول ہیں۔ اسے پتھروں میں سے ارغوانی گوہر کھنگالنا آتا ہے۔ وہ اپنی بات اسلوب سے کہتا ہے۔ اسی لیے اس کے شعر مٹھی سے نکل کر ارد گرد پھیلتے چلے گئے۔''(۷)

ڈاکٹر خورشید رضوی کی غزل کلاسیکیت اور جدیدیت کے رجحانات کا امتزاج ہے۔ اور اصل میں اعلیٰ ترین ادب کے لیے جدیدیت اور کلاسیکیت پر گرفت ضروری ہے۔ وہ شعروں کو موتیوں کی طرح روایتی غزل کے دامن پر اس طرح جڑتے ہیں کہ وہ چمکنے لگتے ہیں۔ انھوں نے غزل میں ماضی کے ادب کی اعلیٰ روایات کو اپنایا ہے۔ انھوں نے جدید خیالات کے ساتھ کلاسیکی شعور سے بھی تاریخی اور تہذیبی طور پر اپنے آپ کو الگ نہیں رکھا۔ ان کی غزلوں کے اشعار جدید فکر سے وابستہ ہیں لیکن ان کا تعلق کلاسیکی روایات سے جڑا ہوا ہے۔ خارزاروں سے ہنس کر گزرنے والوں کو منزلوں کا خود بلانا، بخت کے ستاروں پر بھروسہ نہ کر کے قوتِ ارادی سے اپنی مرادوں کو پورا کرنا، شورِ طوفاں کا جواب گہری خاموشی سے دینا، چلتے رہنے کا مزہ پا لینے کے بعد کسی بھی منزل کو آخری منزل نہ بنانا، کناروں کے روٹھ جانے کے بعد ڈوب کے پار اترنا، خود شکستہ پا ہو کر بھی راہ گیروں کو سفر کا حوصلہ دینا، مسکرا کر ماحول کو خوش بخشنا، خود کو جذبات کی رَو میں بہنے سے بچاتے ہوئے اوروں کو سنبھالنا اور دنیا میں آنے کے بعد دوسروں کے کام آنے کا انسانی جذبہ ڈاکٹر خورشید رضوی کی غزل میں بدرجہ اتّم موجود ہے۔

مجھ سے محروم رہا میرا زمانہ خورشید
مجھ کو دیکھا، نہ کسی نے مجھے جانا خورشید

ڈھونڈنا ہے تو مجھے ڈھونڈ سخن میں میرے
تابِ خورشید حقیقت ہے ، فسانہ خورشید

میں اپنے رشحاتِ قلم کا اختتام ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی ان سطور پر کرتی ہوں:

''اس کے نہاں خانۂ باطن میں کچھ تکمیلی زمانوں کی یاد لہراتی ہے جن میں وہ اپنے باطن کے گنے سائے میں رہتا تھا اور اسے فضا میں بھی پائیداری کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس لیے اب اس کا دل زمانے سے باہر کی رَو کو چاہنے لگا ہے۔ جہاں منطقیت ہو نہ اس سے کسی تجزیے و تحلیل کا مطالبہ کیا جائے، وہ آسماں کی بیکراں وسعتوں میں اُڑتے پرندے کی طرح صرف اپنے دل کی چاپ پر چل کر اَن دیکھے حقائق کا سراغ پا جائے۔ شعر کی قدیم اور جدید روایت سے شاعر کا رشتہ مضبوط ہے، تجربہ منفرد اور اظہار مکمل ہے اور نہایت دل کش۔''(۸)

حوالہ جات:

۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر۔ ''فلیپ''، مشمولہ یکجا۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء۔ ص ۱۳
۲۔ ایضاً۔ ص ۱۴
۳۔ زاہد منیر عامر، ڈاکٹر۔ ارمغانِ خورشید۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۵ء۔ ص ۶۰
۴۔ ایضاً۔ ص ۱۰۰
۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر۔ ''فلیپ''، مشمولہ یکجا۔ ص ۱۳
۶۔ ایضاً
۷۔ زاہد منیر عامر، ڈاکٹر۔ ارمغانِ خورشید۔ ص ۱۲۶
۸۔ ایضاً۔ ص ۲۶

مآخذ:

۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، یکجا۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء۔ ص ۱۳
۲۔ زاہد منیر عامر، ڈاکٹر، ارمغانِ خورشید۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۵ء۔ ص ۶۰